ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مفتی حافظ محمد رمضان اکبر آبادی

مفتی محمد رمضان مرحوم، آگرہ کے دورِ آخر کے نامور عالم، مفتی اور استاد تھے۔ ان کے علمی فیوض برکات کا سلسلہ ان کے زمانۂ وفات تک جاری رہا۔ مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ مفتی صاحب قصبہ لیدری خطیب ضلع فتح پور ہنسوہ کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام مولوی ببر علی بیگ تھا۔ خاندان میں علمی روایات موجود تھیں۔ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۶۸ھ کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن اپنے قصبہ لیدری خطیب میں کیا۔ علم قرأت و تجوید کی باقاعدہ تحصیل کی۔ پھر علومِ درسیہ کی تحصیل آگرہ، کان پور اور لکھنؤ میں کی۔ علامہ عبدالحی فرنگی محلی (ف ۱۳۰۴ھ - ۱۸۸۶ء) ان کے خاص استاد تھے۔ علامہ فرنگی محلی سے وہ بہت متاثر تھے۔ مولانا شاہ سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کان پوری (ف ۱۲۸۱ھ - ۱۸۶۴ء) سے سلسلۂ قادریہ سے بیعت تھے۔ علامہ کشفی اپنے دور کے نامور عالم اور شیخ طریقت تھے۔

تحصیلِ علوم سے فارغ ہونے کے بعد وہ جامع مسجد آگرہ کے مفتی مقرر ہوئے۔ جب مدرسۂ عالیہ آگرہ کے صدر مدرس مولوی عبداللہ صاحب کا انتقال ہوگیا تو مفتی صاحب ان کی جگہ صدر مدرس بنائے گئے۔ درس و تدریس مفتی صاحب کا محبوب مشغلہ تھا، آخر عمر تک درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کا شغل رہا۔ مفتی صاحب نے تفسیر عبداللہ ابن عباس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، غالباً یہ ترجمہ شائع ہوگیا تھا۔ دو چار رسالے اور بھی اسلامی موضوعات پر لکھے تھے۔ مفتی صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ کتب خانہ مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ میں محفوظ تھا۔

مفتی صاحب طلبا سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے۔ اکثر ان کی مدد بھی کرتے تھے، مگر ان کی تربیت و اصلاح کے پیشِ نظر ان کی تادیب و تنبیہ بھی فرماتے تھے۔ درس کے دوران ہمیشہ ایک قمچی ان کے پاس رہتی تھی جہاں طالب علم نے گردان میں غلطی کی اور اس کی پیٹھ پر قمچی رسید ہوئی۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد تمام طلبا کو ریوڑیاں یا بتاشے تقسیم کرتے تھے۔ جس

طالب علم کے قیمی رسید ہوتی تھی اس کو دوگنا حصہ ملتا تھا۔ بعض طلبا دوگنا حصہ حاصل کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر بھی گردان میں غلطی کر جاتے تھے۔ مفتی صاحب اس بات کو سمجھتے تھے مگر صرفِ نظر فرما جاتے تھے۔

جمعرات کے دن مدرسے کی چھٹی جلد ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد مفتی صاحب تعویذ لکھتے تھے۔ ہندو مسلمان سب مفتی صاحب سے تعویذ لیتے تھے۔ کافی رجوع خلق ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں کبھی کسی سے کوئی پیسہ نہیں لیتے تھے، البتہ ریوڑیاں اور بتاشے ضرور آتے تھے جو طلبا میں تقسیم ہوتے تھے۔

جب مفتی صاحب تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے تو وضو کرتے تھے اور طلبا کو بھی ہدایت تھی کہ وضو کر کے شریک درس ہوں۔ البتہ صرف، نحو، منطق اور فلسفہ پڑھاتے وقت وضو کی شرط نہ تھی۔ سبق کے دوران اکثر اپنے استاد علامہ عبدالحی فرنگی محلی کے اقوال ضرور نقل کرتے تھے۔ اس وقت مفتی صاحب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ اکثر چشم پُرآب ہو جاتے اور علامہ فرنگی محلی کے علمی کمالات و تصنیفات کا ذکر کرنے لگتے۔ مفتی صاحب کو اپنے استاد علامہ عبدالحی مرحوم سے بڑا تعلقِ خاطر تھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم اپنا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ حدیث کا درس ہو رہا تھا، مفتی محمد رمضان کے سامنے گاؤ تکیہ رکھا تھا جس پر بخاری شریف رکھی تھی۔ سامنے تپائیوں پر طلبا بخاری شریف کھولے ہوئے تھے۔ ایک شخص قرأت کرتا تھا، دوسرے طلبا سنتے جاتے تھے اور عبارت دیکھتے جاتے تھے۔ طلبا اٹکتے یا کوئی بات دریافت کرتے تو مفتی صاحب اس کی توضیح فرما دیتے۔ درسِ حدیث کے موقع پر مفتی صاحب اور طلبا سراپا ادب و احترام ہوتے تھے۔

مفتی صاحب نے اچانک کتاب بند کی اور سیدھے مسجد کے جنوب کے دروازہ کی طرف گئے سب طلبا نے نشانیاں رکھ کر بخاری شریف بند کر دی اور باتوں میں لگ گئے۔ میری نظر مفتی صاحب کے سلیپروں پر پڑی۔ فوراً اٹھا اور جوتیاں لے کر جنوبی دروازہ کی طرف لپکا۔ مفتی صاحب جنوبی دروازہ تک واپس آچکے تھے، میں نے جوتیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا بیٹا تم دوڑ جاؤ مسجد کے صحن کے پتھر تپ رہے ہیں، میں وضو کر کے آتا ہوں۔ میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب وضو کر کے آئے۔ حدیث شریف کے درس کو ختم کیا

اور پھر اساتذہ کے ادب و احترام اور طلبا پر ان کی شفقتوں کے متعدد واقعات سنائے اور مجھے بہت بہت دعائیں دیں، اور میں مفتی صاحب کی دعاؤں کے اثرات اپنی زندگی میں اکثر پاتا ہوں۔

مولانا محمد حسین الہ آبادی سے مفتی صاحب کے گہرے مراسم تھے، دونوں ہم سبق اور علامہ عبدالحی فرنگی محلی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ مولانا الہ آبادی اجمیر جاتے ہوئے دو چار دن مفتی صاحب کے پاس آگرہ ضرور قیام کرتے تھے۔ اکثر علامہ فرنگی محلی کا ذکر ہوتا اور دونوں حضرات ان کے تذکرہ پر رونے لگتے تھے۔ اس سے ان کے تعلق خاطر کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ فرنگی محلی کے شاگرد اپنے استاد سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

جب مفتی صاحب جامع مسجد سے اپنے مکان تشریف لے جاتے جو محلہ ڈولی کھار میں تھا تو دو چار شاگرد ان کے ہمراہ ضرور ہوتے تھے۔ راستے میں ہندو مسلمان سب مفتی صاحب کو اکثر کھڑے ہو کر سلام کرتے تھے۔ مسلمانوں کو "وعلیکم السلام" سے جواب دیتے، ہندو اگر برابر کا ہوتا تو مزاج پرسی کرتے اور چھوٹا ہوتا تو کہتے "جیتے رہو"۔ مفتی صاحب نہایت حلیم الطبع تھے۔

مفتی صاحب کے تلامذہ میں مولانا عبدالمجید باجوڑی، مولوی عبدالمجید خاں ابن مولانا عبدالغنی (ساکن قائم گنج ضلع فرخ آباد)، حکیم وصی الحسن میونسپل کمشنر (ابن معشوق علی)، مولوی امام الدین، حکیم عبدالستار خاں اور مفتی انتظام اللہ شہابی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مفتی صاحب وسیع اخلاق کے مالک تھے، طبیعت میں انکسار حد درجہ تھا۔ سلام میں سبقت فرماتے تھے، ہر مسلمان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، اسلامی ہمدردی سے دل لبریز تھا۔ انگریزی اقتدار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مسجد کان پور کے حادثۂ فاجعہ نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی سے مفتی صاحب کے تعلقات تھے، انھوں نے کئی طلبا مولانا سبحانی کے مدرسہ الٰہیات میں کان پور بھیجے جن میں مولوی امام الدین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی امام الدین کے ضمن میں ایک واقعہ اور بھی قابلِ ذکر ہے: وہ بڑے پُرجوش عالم تھے، مدرسہ الٰہیات کان پور سے فارغ التحصیل۔ آریہ سماجیوں کے معتقدات اور عیسائیت پر ان کی گہری نظر تھی، بائبل کے حوالے انھیں ازبر تھے۔ ستیارتھ پرکاش کا خوب کھنڈن کرتے تھے، تبلیغ اسلام ان کا محبوب موضوع تھا، وہ دہلی کی ایک اصلاحی و تبلیغی انجمن ہدایت الاسلام میں

ملازم ہوگئے۔ شمس العلما مولانا عبدالحق حقانی اس کے سرپرست تھے۔ جنگ عظیم اول کے دوران ترکی، جرمنی کا حلیف تھا اور برصغیر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں، شمس العلما مولانا عبدالحق حقانی نے مسلمانوں کے انگریزی فوج میں شمولیت کے حق میں فتویٰ دیا۔ پنجاب کے بہت سے علما اور پیر اس طرح کا فتویٰ دے چکے تھے۔

مولوی امام الدین کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ مختلف شہروں میں جا کر مشاہیر علما سے اس فتوے پر تصدیق و تصویب کرائیں، بہت سے نامور علما نے اس پر دستخط کر دیے۔ جب وہ آگرہ آئے اور مفتی محمد رمضان صاحب کے سامنے دستخط کے لیے فتویٰ پیش کیا تو انھوں نے مولوی امام الدین کو فتوے کا پورا پس منظر سمجھایا۔ اس دور کی مسلم سیاست، ترکوں کی حیثیت و اہمیت اور انگریزوں کی چالوں پر براہین و دلائل کی روشنی میں اظہار خیال کیا۔ مولوی امام الدین اس سے بہت متاثر ہوئے۔ دوسرے دن وہ دہلی گئے اور وہ فتویٰ اور اپنا استعفا دے کر آگرہ واپس آگئے۔

یہاں آکر مولوی امام الدین تبلیغ اسلام کے کاموں میں لگ گئے اور انھوں نے ہزار غیر مسلموں خصوصاً گدیوں کو داخل اسلام کیا۔ سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ کچھ دنوں سورت میں بھی کام کیا، وہاں پادریوں سے مچیٹا رہا۔ مولوی امام الدین آخر میں جامع مسجد آگرہ کے امام مقرر ہوگئے تھے۔

مفتی محمد رمضان نے ۶ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو بوقت ۷ ½ شام انتقال فرمایا، دوسرے دن دوپہر کے قریب "پنج کیتوں" کے قبرستان میں دفن ہوئے، نماز جنازہ میں شہر کے معززین اور بہت کثرت سے آدمی شریک تھے جس سے ان کی علمی شان و شوکت اور قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔